پروفیسر علاء الدین اختر

پاکستان میں فکر اور احساس کی تربیت

ہم آئے دن یہ سنتے ہیں کہ ہمارا مروّجہ نظامِ تعلیم ناقص ہے، اس کا اساسی فلسفہ مُردہ ہے۔ معاشرتی علوم میں ہم تاریخی اور تہذیبی بے سمتی کا شکار ہیں۔ اور سائنسی علوم میں بے ہمتی اور بے مقصدیت کا۔ ہماری تعلیم نہ ہمیں معاشرتی تقاضوں کو سمجھنے کا ادراک دیتی ہے اور نہ ہی اجتماعی ضرورتوں کا صحیح احساس۔ گویا سارا تعلیمی ڈھانچہ ایک طرح کا جسدِ بے جان اور چشمِ بے نور ہے۔ حتیٰ کہ پچھلے دنوں یہ بھی سننے میں آیا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنی تعلیمی ضرورتوں کی طرف سے مسلسل اغماض برتا۔ ہم یہ بھی سنتے ہیں کہ نظامِ تعلیم میں اصلاح کر دینے سے ذہنوں کا اندھیرا چھٹ جاتا ہے۔ خوف، مایوسی اور حزن، ہمت، عزم اور انبساط میں بدل جاتے ہیں اور معاشرے میں ایسے افراد کی کمی نہیں رہتی جو خورشید کا سامانِ سفر تازہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی اپنی جگہ درست، مگر غالباً آج تک پاکستان کے تعلیمی حلقوں میں اس بنیادی سوال پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا کہ ہمارے ملک جیسی نظریاتی مملکت میں فکر اور احساس کی تعلیم و تربیت پر اگر مناسب توجہ نہ دی جائے تو نوجوان نسل کے فکر اور احساس کس راہ پر چل نکلتے ہیں اور معاشرہ کن مسائل سے دوچار ہو جاتا ہے۔ تعلیم اگر افراد کے تاریک ذہنوں کو جلا بخشتی ہے، جرأتِ ایمانی عطا کرتی ہے، سوزِ یقین دیتی ہے اور اجتماعی اولوالعزمی کے لیے راہیں ہموار کرتی ہے، تو اسی وقت جب فکر اور احساس کی تعلیم اور تربیت کے بارے میں دقتِ نظر سے کام لیا جائے اور انھیں نئے زاویوں میں ڈھالا جائے، تاکہ نہ فکر پہ جمود طاری ہو اور نہ احساس پر سکوتِ مرگ۔ اور اس طرح نوجوان نسل اس قابل ہو جائے کہ وہ اپنے فکری اور جذباتی ورثے اور دوسروں کے افکار و تجربات سے استفادہ کر سکے۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ نظریاتی مملکتیں تو چین اور روس بھی ہیں۔ مگر پاکستان چونکہ ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہے، اس لیے ہمیں اپنے لیے راہ نما اصول نہ ماؤزے تنگ کی تحریروں میں تلاش

کرتے ہوں گے اور نہ ہی لینن اور مارکس کی کتابوں میں۔ انھیں قرآن مجید اور احادیث نبوی سے لینا ہوگا تاکہ ان کی روشنی میں افراد کی سیرت اور کردار کی تشکیل کی جا سکے اور معاشرے میں اجتماعی زندگی کے اسلوب وضع ہوں۔ سیرت اور کردار کی تعمیر میں تعلیم کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اور اس پر کسی بحث و تمحیص کی گنجائش ممکن نہیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نظریات اور اقتصادیات کی اہمیت کو بھی انہی راہ نما اصولوں کی روشنی میں دیکھنا ہوگا، ورنہ افراد کی سیرت اور کردار پر نظریات کی چھاپ مصنوعی ہوگی اور بحیثیت جماعت کے وہ کسی خاص رنگ میں نہ رنگے جا سکیں گے اور انھیں یہ شعور کبھی نہ دیا جا سکے گا کہ نظریاتی مملکت میں اصحاب علم میں حسن اخلاق اور حسن عمل دونوں کا امتزاج کیوں کر ضروری ہے۔

ہم یہیں موقوف نہیں۔ آج کل قریب قریب ساری دنیا کا یہی المیہ ہے کہ ایک طرف تو حالات کا تقاضا یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ذہین افراد سامنے آئیں جو فرداً فرداً اپنی ذمہ داری کا احساس کریں، مگر دوسری طرف قدم قدم پر ایسے متعدد عوامل سرگرم کار ہیں کہ بالغ نظر اور جرأت مند شخصیتوں کا جینا دوبھر ہو گیا ہے اور منفرد کردار کے لوگ اپنے کو بھری دنیا میں اکیلے اکیلے محسوس کرنے لگے ہیں۔ آج کی دنیا اور اس کے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں کہ انھیں سمجھنا اور سمجھانا آسان نہیں، اور جب تک کسی چیز کو سمجھا نہ جائے، اس کے متعلق نہ صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے نہ صحت مند احساس استوار ہو سکتا ہے۔ غالباً یہ سمجھنا تو مشکل نہیں کہ کسی پر اور کہاں کہاں کیا بیت گئی، مگر اس پر یہ ابتلا کیسے پڑی اور کہیں کوئی واقعہ کیوں سرزد ہو گیا، یہ سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ کیونکہ ان فکری اور حسیاتی محرکات کو سمجھے بغیر جو کسی واقعہ کے تحت کارفرما ہوتے ہیں، یہ جاننا ممکن نہیں کہ کوئی واقعہ کیوں ہوا، کیسے ہوا، اور اس سے کسی نے جو تاثر قائم کیا وہ کس حد تک مستحسن یا غیر مستحسن تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ فکر اور احساس کا تجزیہ کیے بغیر نہ کوئی عقلی حظ میسّر آ سکتا ہے اور نہ جمالیاتی لطف۔ دونوں کی عدم موجودگی میں جو عملی اقدامات ہوں گے ان کا حاصل کیا ہوگا، یہ ظاہر ہے۔ اس لیے اگر بے جان، بے نور، نہی از شعور شخصیتوں کا پالنا مقصد تعلیم نہیں، جو یقیناً نہیں، تو پھر تعلیمی نظام میں خصوصاً، اور معاشرے کے دیگر تار و پود میں عموماً، فکر اور احساس کی تربیت کا مناسب بندوبست کرنا

ہوگا۔ میں اس گفتگو کو صرف تعلیمی اور تدریسی نظام تک محدود رکھوں گا۔

فکر اور احساس کی تربیت کا التزام کرنے کے لیے تعلیم کے مقصد متعین کرنے ہوں گے۔ ان کا ادراکی، تاثیری اور ترغیبی (COGNITIVE, AFFECTIVE, CONATIVE) تجزیہ کرنا ہوگا۔ تاکہ پاکستانی بچوں کو بتایا جا سکے کہ زندگی محض امروز و فردا کا نام نہیں، بلکہ یہ جاوداں اور ہر دم جواں ہے۔ تبھی وہ روایات سے منہ موڑے بغیر آگے بڑھنا سیکھیں گے۔ تحقیق و جستجو کی نئی راہیں وا کرنے کا حوصلہ پا سکیں گے۔ ان کے افکار اور احساسات میں گھٹن پیدا ہونے کی بجائے تازگی اور شگفتگی پیدا ہوگی۔ اور وہ اس قدر جرأت مند ہوں گے کہ اپنی کامیابیوں پر سجدۂ شکر بجا لائیں اور اپنی کوتاہیوں کا اندازہ کر کے ان کا ازالہ کر سکیں۔

غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ کام صرف مدرسہ نہیں کر سکتا۔ اور صرف والدین بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان کی صاف بیل قرآنی فلسفۂ تعلیم اور قرآنی تدریسی نظام ڈالے گا۔ جس میں فکر اور احساس کی تعلیم اور تربیت کے تمام سرچشمے پیغام خداوندی سے پھوٹیں گے، جہاں علم کو ایک ایسی وحدت سمجھا جائے گا جس کے بیسیوں پہلو ہوں اور کوئی پہلو اپنی افادیت اور نوعیت میں بے شعور نہ ہو۔ ہر شخص کی اپنی اپنی استعداد ہوتی ہے اور اسی کے مطابق وہ علم کے کسی ایک پہلو کو چن لیتا ہے یا چن لینے کا حق رکھتا ہے۔ یہی اختیار اور لگن کسی کو ریاضی دان بنا دیتے ہیں، تو کسی کو صاحب فکر۔ اکتسابِ علم ذاتی سعی کا ثمرہ ہوتا ہے۔ اور اعترافِ عجز اکتسابِ علم کا سب سے مؤثر وسیلہ۔ آج کل تخصیص (SPECIALISATIONS) کے زمانے میں علم کے سبھی پہلوؤں پہ قدرت حاصل کرنا بعید از قیاس ہے۔ مگر علم خواہ سائنس کا ہو یا جمالیات اور اخلاقیات کا، اسے حاصل کرنے کا بنیادی عمل ایک ہی ہے۔ عناصر الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ جو شخص بھی من کے اندر ڈوب جاتا ہے وہ سراغِ زندگی پا لیتا ہے۔ ریاضی دان بھی من کی گہرائی میں ڈوب کر ابھرتا ہے اور صاحب فکر کا سینہ بھی من کے اندر ڈوب کر ہی روشن ہوتا ہے۔

من کی گہرائیوں میں ڈوب کر ابھرنے کے لیے شب بیداری ہی کافی نہیں، پیچ و تاب جاوداں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ البتہ نظریاتی اسلامی مملکت میں یہ احتیاط لازم ہوگی کہ نوجوان نسل میں سائنسی اور معاشرتی علوم کے لیے جو کشش یا عدم دلچسپی ہو اس میں اعتدال رہے۔ کیونکہ بے اعتدالی اپنے سے مختلف نگاہ رکھنے والے کا احترام کرنے کا حوصلہ باقی نہیں رہنے دیتی۔

صحیح استدلال کی عادتیں راسخ نہیں ہونے دیتی۔ کردار کے جذباتی محرکات کو سمجھنے کا سلیقہ پیدا نہیں ہو پاتا۔ ننگ و شبہ راہ کا سنگِ گراں بن جاتا ہے۔ علم نو کا وسیلہ نہیں بنتا اور رفتہ رفتہ تجسس کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ اس لیے نظریاتی مملکت میں اس بات کا بھی اہتمام کرنا ہوگا کہ نوجوان جب عمرانیات، نفسیات، اخلاقیات، منطق یا دیگر علوم سے روشناس ہوں، تو ہم عصر فکری تحریکوں کا مطالعہ ان میں اپنے تہذیبی ورثہ اور لسانی روایات کی پاس داری کا احساس پیدا کرے۔ اور وہ حسنِ فکر کے ساتھ حسنِ احساس کی ضرورت کا شعور بھی حاصل کر سکیں حسنِ فکر اور حسنِ احساس سے ہی حسنِ اظہار و عمل کی قندیل روشن ہوتی ہے۔ متوازن راسخ ذہنی کا جذبہ اُبھرتا ہے اور عجلت سے احتراز کا وصف پیدا ہوتا ہے۔ نئی نسل لب و لہجہ کی تلخی سے بھی تب ہی بچ سکے گی، جب وہ زبان و خیال کے باہمی رشتوں سے واقف ہوگی۔ مختصراً یوں کہیے کہ پاکستان میں تعلیم و تدریس کی صحیح فضا تب پیدا ہوگی جب یہاں کے تعلیمی پروگرام کی اساس ایسے راہ نما اصولوں پر رکھی جائے گی جو بہ حیثیت فرد اور قوم پاکستانیوں کی فکری رہبری کریں، ان کے احساس کی تربیت کریں اور ان میں عمل کی شمع فروزاں کر دیں۔ اور ایک ایسا جامع نظامِ تعلیم مرتب ہو جائے کہ ہر فرد اپنی جسمانی صلاحیتوں اور ذہنی قابلیتوں کی پرورش کر سکے [illegible] فرائض سرانجام دے سکے کہ تمام پاکستانی ایک روشن خیال، بالغ نظر، با مقصد [illegible] بہ جزش عمل قوم بن سکیں۔ چنانچہ میرے نزدیک نظریاتی اسلامی مملکت میں تعلیمی مقاصد کا ذہنی عمل کی تینوں سطحوں پر یعنی ادراکی، احساسی اور عملی، جو تجربہ ہوگا، وہ کچھ یوں ہوگا کہ ادراکی سطح پر بچوں کو یہ باور کرانا ہوگا کہ وہ ایک اسلامی مملکت کے بچے ہیں۔ اسلام ان کا دین ہے۔ وہ ایک خدا کو مانتے ہیں، جو رب العالمین ہے۔ اسی کی اطاعت اور پیروی کرتے ہیں۔ کسی اور کو نہ اپنا رب مانتے ہیں اور نہ اس کے سامنے جھکتے ہیں۔ اور سوائے اپنے رب کے کسی سے خوف بھی نہیں کھاتے۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، وہ خدا کی ملکیت ہے، جو بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔ انسان صرف اس کی املاک کا امین ہے۔ سبھی انسان بہ حیثیت انسان برابر ہیں، رنگ و نسل اور دنیاوی وجاہت وجہ امتیاز نہیں۔ افضل وہی ہے جس کے اعمال اور اخلاق اچھے ہیں۔ دنیا عمل کا میدان ہے۔ یہاں سربلندی انہی کو ملتی ہے جو قرآن کی تعلیمات میں غور کرتے ہوئے ایک دوسرے

کی نشوونما کے ذمہ دار بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک دن ایسا بھی آئے گا جو حساب کتاب کا دن ہوگا، اور اس دن بھی وہی سرخرو ہوگا جس نے اس دنیا میں اپنے تمام ارادوں کو خدا کے احکام کا پابند کر دیا ہوگا۔ اور بہت حسن و خوبی سے باہمی معاملات میں میانہ روی اختیار کی ہوگی۔ صحت مند رہنا ایک اہم ضرورت ہے۔ علم حاصل کرنا ایک مقدس ترین فرض ہے۔ اور سچ بولنا بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ عملِ احسان، اجتہاد، تحقیق و جستجو، آزادیٔ فکر اور مسلسل جدوجہد ذہنی تربیت اور انفرادی و معاشرتی بہبود کے مختلف ذریعے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر ان بچوں کو یہ یقین دلانا ہوگا کہ وہ ایک ایسی قوم کے بچے ہیں۔ جسے خدا نے تمام بنی نوع انسان کی فلاح کا فریضہ سونپا ہے۔ یہ فریضہ اتنے ہی عرصہ تک پورا ہوا یا پورا ہوگا، جتنا عرصہ ان کے دل و دماغ پر قرآنی احکام اور اصول حکمرانی کریں گے اور ان سے روگردانی کی سزا ہمیشہ تیرہ بختی و رسوائی ہوگی۔

احساسی سطح پر بچوں میں وطن کی حفاظت کرنے اور سالمیت کو برقرار رکھنے کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔ نوجوانوں کو اسلام کے مطابق رہنے سہنے کے طور طریقوں کو اپنانے کا شوق دلانا ہوگا۔ ایسی اقدار کی عظمت اور ان کو فروغ دینے کا جذبہ استوار کرنا ہوگا جو ایک فرد کو دوسرے کی عزت کرنا سکھائیں اور زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے رموز سے واقف کرا سکیں۔ دین سے ذہنی لگاؤ کو جذباتی لگاؤ میں ڈھالنا ہوگا تاکہ خدا کو لائقِ سجود سمجھنے، حکیم مطلق ماننے، یوم حساب اور ہر شے کا مالک جاننے اور اسی کو اپنا رب تصور کرنے کا لازمی نتیجہ ایسے جذبے کی شکل میں نکلے جس سے سرشار ہو کر پاکستانی بچے اور نوجوان خود بخود ان کاموں میں دلچسپی لینے لگیں جو نہ صرف ان کے اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی باعثِ اطمینان و انبساط ہوں۔ خیر کے انہی جذبات کو نئے موڑ دے کر یہ خیال ذہن نشین کیا جائے کہ ہر انسان کی عزت اس لیے کی جائے کہ وہ انسان ہے، اور بہ حیثیت ایک پاکستانی کے ہر بچہ یہ محسوس کرے کہ خدا کے سوا کوئی اور کسی کا رزاق نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امتِ وسطیٰ کے فرد ہونے کی حیثیت سے پاکستانی نوجوانوں کی یہ انفرادی اور سماجی ذمہ داری ہے کہ تمام دنیا سے نہیں تو کم از کم اپنے ملک سے غربت، جہالت، تنگ نظری، حسد، کینہ اور تعصب ختم کریں۔ نہ کسی سے زیادتی کریں اور نہ اپنے اوپر زیادتی ہونے دیں، اور نہ کسی کی رعایت کریں، تاکہ کوئی کسی کا محتاج نہ ہو سکے۔ چونکہ ایمان کی پختگی اور احساس کی

صداقت کا نتیجہ عمل ہی سے نکلتا ہے، اس لیے پاکستانی بچوں کی روزمرہ زندگی میں ایسے کاموں کا اہتمام کرنا ہوگا جو ان کے ایقان اور احساسات کی عملی تفسیر ہوں۔ چنانچہ عملی سطح کے لیے کچھ ایسے اقدامات کرنے ہوں گے کہ پاکستانی بچے اپنے ملک کے میدانوں، وادیوں، پہاڑوں اور دریاؤں سے روشناس ہو سکیں۔ ان کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں۔ ان کی حفاظت کر سکیں۔ اندرونِ ملک تاریخی، و ثقافتی اہمیت کی عمارتوں، عبادت گاہوں، سیرگاہوں، جنگلوں اور قدرتی مناظر کو دیکھ سکیں اور ان کے حسن و جلال سے محظوظ ہو سکیں تاکہ مظاہرِ قدرت میں جو توازن و خوب صورتی ہے اس سے واقف ہو کر اپنی شخصیت اور کردار میں حسن پیدا کرنے کی اہمیت کا اندازہ کر سکیں۔ انھیں قائدِ اعظم اور دیگر پاکستانی رہنماؤں کے سوانحِ حیات سے یوں متعارف کرایا جائے کہ وہ خود دیکھ سکیں کہ اتحاد، یقین اور عمل کیسے کیسے سنگلاخ راستوں کو ہموار کر دیتے ہیں۔ ہر آدمی کے اعمال خود اپنا بدلہ اور نتیجہ بن جاتے ہیں۔ اور منافقت، بے غیرتی، بے حسی، خوشامد اور خود غرضی کیا گل کھلاتی ہیں۔ مشاہیرِ عالم کی زندگی کے حالات انھیں اس طور پر بتلائے جائیں کہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ کوشش کے بغیر کسی کو کچھ نہیں ملتا اور مسلسل جد و جہد کامیابی سے ہم کنار کر دیتی ہے۔ تاکہ ان کی اپنی زندگیاں عمل اور اشتراک و تعاون کا نمونہ بن جائیں۔ انھیں تعلیمی ماحول میں ایسے حالات اور آزمائش میں ڈالنا ہوگا کہ وہ جعلی انکساری اور عیب جوئی سے اجتناب کریں۔ خوش خلقی ان کا شیوہ ہو جائے۔ دیانت داری ان کی گھٹی میں پڑ جائے۔ السلام کہنی، ملنساری اور ایثار نفسی ہمدردی ان کے روزمرہ کے اوصاف بن جائیں۔ سچ بولنا اور شائستہ گفتگو کرنا ان کا عام وتیرہ ہو جائے۔ تعلیمی اور تدریسی اوقات میں ان کے لیے جسمانی ورزش کا اہتمام کرنا ہوگا۔ روزانہ حاضری کے دستور کو بدلنا ہوگا۔ کتابوں کو ازبر کرنے کے رجحان کو روکنا ہوگا۔ کتابیں اس طور پر تحریر کرنی ہوں گی کہ وہ خود تنقیدی سوچ کا وسیلہ بن سکیں اور ان کا مقصد سوالوں کا جواب دینا کم ہو اور جوابات تلاش کرنے کی ترغیب دینا زیادہ۔ اوائلِ عمر سے ہی کتب بینی کا شوق پیدا کرنا ہوگا۔ مطالعہ کے صحیح طریقوں کو رائج کرنا ہوگا۔ امتحانات کے وقت نگرانی کے مروجہ طور طریقوں میں تبدیلی کرنا ہوگی۔ استاد اور شاگردوں کو مشترک مقصد کے حصول میں مصروف کرنے کے لیے تدریسی اور تفریحی اسباق اور مشاغل وضع کرنے ہوں گے جو باہمی تعاون کا نمونہ ہوں۔ بچوں کی قوت

و صلاحیت کو مناسب رُخ دینے کے لیے اور ملک میں موجود ذریعۂ ابلاغ کے مُضر اثرات سے ان کو محفوظ رکھنے کے لیے مدرسوں، گھروں، کوچہ و بازار، کھیتوں، باغوں اور فیکٹریوں میں غرضیکہ ہر جگہ خدا کا خوف ان کے اندر پیدا کرنا ہوگا اور خدمتِ خلق کے مواقع انھیں مہیا کرنے ہوں گے۔ انھیں ہر طرح کی فلاحی سرگرمیوں میں شریک کرنا ہوگا اور ان سے محنت و مشقت کے معمولی کام لینے ہوں گے تاکہ وہ محنت کی عظمت اور احترامِ انسانیت سے واقف ہو سکیں۔ مختصر یہ کہ انفرادی اور اجتماعی طریقوں پر اشتراکِ عمل اور خود احتسابی کے تمام ممکن مواقع نہ صرف مدرسوں اور گھروں میں مہیا کرنے ہوں گے بلکہ انھیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ الزام تراشی، دروغ گوئی، ستم رانی، عیب جوئی اور بلا تحقیق باتوں کو مان لینا اور دوسروں کے سہارے جینا اور مرنا کیوں کر کسی فرد اور معاشرے کو فکر و عمل کی قوتوں سے محروم کر دیتا ہے۔ تعلیم کے مقاصد کے تجربے سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ احساس فکر اور عمل جدا جدا اور الگ الگ کوئی چیز ہیں یا کوئی تعلیمی اور تدریسی نظام ان کی علیحدہ علیحدہ موثر تربیت کر سکتا ہے۔ برخلاف اس کے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جذبات میں سطحیت اور خرد کی تہی دامنی اکثر ایک دوسرے کا پتہ دیتے رہتے ہیں۔ جذبات میں سطحیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی شخص فرسودہ اجتماعی تفریحات کا عادی ہو کر دل و جان سے ان کا شیدائی ہو جائے اور اس کی اپنی کوئی پسند نہ رہے۔ اجتماعی تفریح کا ایسا ہی متوالا بن نوجوان نسل میں فکر و احساس کی یہ منہج ڈالتا ہے کہ کتاب خریدتے وقت اس کا سرورق دیکھا جاتا ہے کہ وہ کتنی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ فلم دیکھنے سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ کتنے ہفتوں سے مسلسل دکھائی جا رہی ہے۔ یہی اندازِ فکر نوجوان میں اس میلان کو پختہ کرتا ہے کہ ہر مقبولِ عام شے ان کو بھا جاتی ہے۔ وہی گانا ان کو پسند آتا ہے جو ہر ایک کی زبان پر ہو۔ وہ اخبار ضرور پڑھا جائے گا، جس کی اشاعت سب سے زیادہ بتائی جاتی ہو۔

تنگ لباس اور فیشن اور نئی نئی وضع قطع بھی اس تقلیدی ذہنیت کی غمازی کرتے ہیں۔ احساس کا کھوکھلا پن اور فکر کی نیم پختگی انھیں یہ سمجھنے ہی نہیں دیتی کہ سب میں رہ کر بھی انفرادیت قائم رکھی جا سکتی ہے۔ نظریاتی سطح پر اسی بات کو سمجھنا ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے بالاتر کیسے رہا جاتا ہے۔ فکر اور احساس کا بُعد نوجوان شعرا سے ایسے شعر تو کہلوا سکتا ہے

جو مستعار جذبے کی چغلی کھاتے ہیں، مگر ذہن پر اپنی کوئی چھاپ نہیں چھوڑ سکتے۔ بات وہی جو دل میں اتر جائے اور دل میں وہی بات اترتی ہے جو جذبات کی سچائی میں رچ کر نکلی ہو اور فکر کی پاکیزگی سے دُھلی ہو۔ ملتِ اسلامیہ کا فرد اسی وقت ملتِ اسلامیہ کا فرد بنے گا کہ جب ایک مُسلم آنکھ سے آنسو بہے تو ساری مُسلم آنکھیں تر ہو جائیں۔ اور راہِ حق میں ایک قدم اُٹھے، تو سارے عالمِ اسلام میں اس کی بازگشت سُنی جا سکے۔ اگر طلبا قوم کا مستقبل ہیں، تو پھر تعلیمی اداروں میں ان کے کردار اور احساس کی تعلیم سے غفلت نہیں برتی جا سکتی۔ ان کا مستقبل انہی استادوں کے ہاتھ میں دیا جا سکتا ہے، جو ان کے مسائل کو فکر اور احساس کے صحیح ترازو میں تول سکیں اور پوری ذمہ داری سے ان کے سوچ اور احساس کو جان سکیں۔

ہم کلام ہونے کے لیے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے اور زبان کی جڑیں جذبات کے اندر دُور دُور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ لہٰذا نظریاتی مملکت میں درس و تدریس کا اہتمام اسی ملک کی زبان میں ہو۔ تاکہ ایسے نوجوان پروان چڑھیں جن کی شخصیتیں متوازن ہوں۔ شخصیت متوازن اسی وقت ہوتی ہے جب ہر شخص اپنی جگہ خود سوچے، خود محسوس کرے اور جو کچھ کرے اس کی پوری ذمہ داری قبول کرے۔ ایک نظریاتی ملک میں فکر و احساس کی تعلیم جب تک طلبا میں یہ صلاحیت پیدا نہیں کرتی کہ وہ یہ دیکھ سکیں کہ تجربے کے متعلق بات کرنے اور تجربے سے دوچار ہونے میں کیا فرق ہے، وسیع القلب اور وسیع النظر نوجوان پیدا نہیں ہو سکتے۔ تجربے کے متعلق بات کرنے اور تجربے سے دوچار ہونے میں جو فرق ہے وہ سمجھانے کی بات کم ہے اور سمجھنے کی زیادہ۔ کیونکہ یہ فرق وہی سمجھ سکتا ہے۔ جو یہ جانتا ہے کہ کسی واقعہ میں سے ہو کر گزرنا کیا ہوتا ہے اور اس کے متعلق کوائف گنوا دینا کیا ہوتا ہے۔ احساسات کے متعلق میری رائے کو اگر آپ مان لیں، تو یہ آپ کی رائے نہ ہوگی بلکہ یہ بات محض امر واقعہ ہوگی۔ وہ شاعر تنگ بند ہی رہتا ہے جس کی اپنی شخصیت میں حقیقی اور گہرے جذبات کی تپش اور لَو نہ ہو۔ تغزل کے لیے محض زلف و یار کی بات کرنا ہی کافی نہیں، گیسوئے کائنات سنوارنے کی سوچ بھی ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ پاکستانی بچوں کے فکر اور احساس کی صحیح طور پر اسی وقت تربیت ہوگی جب انھیں تجربوں سے دوچار ہونے کے وافر امکان مہیا کیے جائیں۔ نظریاتی ملک تجربات کی نوعیت کا تعین کر سکتا ہے۔ ان

کے تسلسل کا اہتمام بھی اس کے قابو میں ہو سکتا ہے۔ مگر تجربات سے خود بینی کی راہ میں کوئی اور چیز باہر سے حائل نہیں کرتا۔ اس ضمن میں اگر کوئی خارجی چیز حائل ہوتی ہے۔ تو وہ فضا جس میں وہ سانس لیتے ہیں۔ یا وہ نظام جس کی اساس سوچے سمجھے اصولوں پہ رکھی گئی ہو اور جس نے تدریسی لوازمات میں یہ خیال راسخ کر دیا ہو کہ تعلیم اور تربیت افراد کے مابین ایک رابطہ ہے، کوئی جلسے جلوس کی بات نہیں۔ اور یہ سکھا دیا ہو کہ یہ رابطہ اس وقت قائم ہوتا ہے جب شاگرد اور استاد دونوں کچھ سیکھنے سکھانے کے لیے آمادہ ہوں۔ شاگرد استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرے اور استاد کا دامن شفقت سے بھرا ہوا ہو۔ معاشرے میں بزرگ اپنے عقائد کے مطابق گزر بسر کر رہے ہوں۔ القصہ پاکستان کے تعلیمی ماحول میں طالب علموں کی فکر اور احساس کی تعلیم کو جن خطوط پہ استوار کرنا ہوگا اس کے لیے میں علامہ اقبال کے وہ الفاظ آپ کو یاد دلاتا ہوں جو انھوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء میں خطبہ صدارت دیتے وقت کہے تھے۔ وہ فرماتے ہیں" جس مذہب کی آپ نمائندگی کرتے ہیں، وہ فرد واحد کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی تربیت کرتا ہے۔ تاکہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور انسان کی خدمت کے لیے وقف کر دے۔ اس کے امکانات ابھی تک ختم نہیں ہوتے ہیں۔ وہ اب بھی ایک ایسی نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جہاں انسان کا معاشرتی درجہ اس کی ذات، رنگ اور دولت سے متعین نہ ہوتا ہو بلکہ اس زندگی کے مطابق قائم کیا جاتا ہو جسے وہ بسر کرتا ہے۔ جہاں غربا مالداروں پر ٹیکس عائد کرتے ہیں۔ جہاں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر قائم نہ ہو بلکہ روحوں کی مساوات پر ہو۔ جہاں ایک اچھوت بادشاہ کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہو۔ جہاں نجی ملکیت ایک ٹرسٹ کی شکل رکھتی ہو۔ اور جہاں سرمایہ جمع کرنے کی اس طرح سے اجازت نہ دی جائے کہ وہ اصلی دولت پیدا کرنے والے پر غلبہ حاصل کر لے مگر آپ کے مذہب کا یہ اعلیٰ تخیل ملاؤں اور شریعت پرستوں کی دقیانوسی خیال آرائیوں سے رہائی کا طالب ہے"

اسی خطبہ میں حضرت علامہ نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ روحانی طور پر ہم خیالات اور جذبات کے ایسے جال میں زندگی بسر کر رہے ہیں جنھیں ہم نے صدیوں کے دوران میں اپنے گرداگرد اپنے ہی ہاتھوں سے بُن لیا ہے۔ اور اس بات کے کہنے کی بھی ضرورت ہے (اگرچہ یہ بات بوڑھی نسل والوں کے لیے باعث شرم ہے) کہ ہم نوجوان نسل کو اقتصادی و سیاسی نیز مذہبی خطرات و مشکلات

کے مقابلے کے لیے جو موجودہ دور اپنے ہمراہ لا رہا ہے، مسلح کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ساری قوم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی موجودہ ذہنیت کی مکمل طور پر جانچ پڑتال کرے تاکہ وہ نئے مقصودوں اور تخیلات کی لگن کو محسوس کرنے کے قابل بن سکے۔ ہندی مسلمان خود اپنی اندرونی زندگی کی گہرائیوں کی چھان بین کرنے سے عرصے سے غافل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی پہلی چمک اور رنگینی میں زندگی بسر کرنے سے عاری ہو چکا ہے۔ اور اسی لیے وہ ایسی قوتوں کے ساتھ ایک غیر ولیرانہ سمجھوتہ کرنے کے خطرہ میں ہے جن کے متعلق اسے یہ کہا گیا ہے کہ وہ کھلی آویزش میں ان کو مغلوب نہیں کر سکتا۔ خدا تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود ایک مخصوص تخیل کی روشنی سے اپنی روزانہ زندگی کی جدوجہد کے دائرہ کو منور کر کے اپنی حالت کے بدلنے میں پہل نہیں کرتی۔ انسان کی اپنی اندرونی زندگی کی آزادی میں مضبوط اعتقاد رکھے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی اعتقاد قوم کی آنکھ کو اس کے انتہائی مقصد پر جمائے رکھتا ہے۔ اور اسے وقتی تذبذب سے نجات دلاتا ہے۔ جو سبق گزشتہ تجربہ نے آپ کو سکھایا ہے اسے ہمیشہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ کسی سے بھی کسی چیز کی توقع مت رکھیے۔ اپنی خودی صرف اپنے اوپر مرکوز رکھیے اور اپنی ہستی کو حقیقی معنوں میں پختہ کیجیے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی خواہشات پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ مسولینی کا اصول یہ تھا کہ "جو فولاد رکھتا ہے وہی روٹی کھاتا ہے" میں اس میں ذرا ترمیم کرنا چاہتا ہوں اور کہتا ہوں کہ "جو خود فولاد ہے، سب کچھ اسی کے پاس ہے"۔

سخت کوش بننے اور سخت محنت کرنے ہی میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا راز مضمر ہے۔ زندگی کی لو دوسروں سے مستعار نہیں لی جا سکتی۔ اسے خود اپنی روح کے اندر روشن کرنے کی ضرورت ہے۔" علامہ اقبال کے ان الفاظ کی روشنی میں یہ برملا کہا جا سکتا ہے کہ جب ہم قصبی اداروں میں اپنے اندر زندگی کی لو مخصوص عقائد کی روشنی میں روشن کرنے کا درس دینا سیکھ لیں گے تو خود بخود فکر اور احساس کی صحیح تعلیم و تربیت ہونے لگے گی۔